شہر کے دوسرے کنارے سے
احمد حسین مجاہد

احمد حسین مجاہد کی شاعری، نثر اور شخصیت قدم بہ قدم تحیرات کا طلسم کدہ ہے۔ اس کے کسی بھی شعر میں زبان و بیان کا در و بست دیکھیں تو اس کا احوال، نظریہ اور اسلوب واضح ہو جاتا ہے کیوں کہ اس نے الفاظ اور مضامین کو حیرت انگیز مجاہدانہ نقوش سے آراستہ کر رکھا ہے۔ اس کے لہجے کی ہمہ وقت گھمبیرتا متنوع فکری مگر تغزل سے بھرپور مناظر اس طرح سامنے لا کھڑا کر دیتی ہے کہ دماغ دور کی وادیوں کی سیاحت پر نکل جاتا ہے۔ اس کے شعروں میں معنی کی ہمہ گیریت ایسی ہے کہ جو اس کی شخصیت اور فن کے تائیدی جوہر پیش کرتی ہے۔ اس نے شاعری میں اپنے 'طرزِ عمل' کی بنیاد رکھی اور اس طرزِ عمل میں جذبات و احساسات کی لطیف ترسطحوں کو اپنی انگلیوں سے چھو کر سانس لیتے پیکروں میں ڈھال دیا۔ احمد حسین مجاہد نے متنوع بحروں کے استعمال سے بھی اپنے معیارِ شعر کی انفرادیت کا پتا دیا ہے۔

امتیاز الحق امتیاز

شہر کے دوسرے کنارے سے

احمد حسین مجاہد

کولاج پبلی کیشنز

شہر کے دوسرے کنارے سے

نام کتاب : شہر کے دوسرے کنارے سے
مصنف : احمد حسین مجاہد
اشاعت اوّل : 2025
ٹائٹل ڈیزائن : ارشد حسین
سرورق پینٹنگ : عجب خان
قیمت : 900 روپے

Shehr Ke Dosre Kanare Se
(Urdu poetry by Ahmad Hussain Mujahid)

Printed by: Haji Munir Kamboh & Sons. Lahore.Pakistan
Price in Pakistan: 900.00

Published by:

کولاج
ادب، سماج اور ہماری نسل
Ground Floor Surya Plaza Neela Gonbad
New Anarkali,Lahore
hammadniazi@live.com +92-321-4036980
ISBN:978-969-7987-24-5

عالیہ احمد کے نام

تمھیں دیکھا
تو آنکھ اٹھنے سے پہلے
دل جھکا تھا
آسمانوں تک کوئی زینہ نہیں جاتا
مگر وہ دن، مرا دن تھا
تمھیں میں غیر ممکن کی گلی سے
خواب کی دہلیز تک لے کر چلا آیا
تمھیں معلوم ہے تم پھر بھی
اکثر پوچھتی ہو
میں کہیں جاتے ہوئے
اُس دن
گلی میں کیوں رکا تھا

ترتیب

۱۔	اے مرے پروردگار!	۹
۲۔	ڈوبنے والا تھا جب سوئے مدینہ دیکھا	۱۰
۳۔	گناہ گار ہوں دہلیز پر بٹھا دیجے	۱۱
۴۔	آزار اٹھا کر بھی جلاتے ہیں چراغ	۲
۵۔	تری آنکھیں	۱۴
۶۔	بھڑکتی آگ سے آخر اٹھایا نم میں نے	۱۵
۷۔	ہر شے ہے کائنات کی اس کے لباس میں	۱۷
۸۔	وہ سمجھتا ہے اس کنائے کو	۱۹
۹۔	جو دل میں ہے وہ لبِ چشمِ تر نہیں آیا	۲۱
۱۰۔	مجھ کو جلتے شجر کے سائے میں جب بھی اس نے بلایا ہوتا ہے	۲۳
۱۱۔	میری وحشت جگمگائے گی زمیں کے آس پاس	۲۵
۱۲۔	جنوں میں یار سے آگے قدم نہ پڑ جائے	۲۷
۱۳۔	کسی بے انت جذبے کی نگہبانی میں رہتا ہوں	۲۹
۱۴۔	اپنے ہی اسیر ہو گئے ہیں	۳۱
۱۵۔	صاد قینی ٹیڑھ	۳۳
۱۶۔	ہائے! افسوس!	۳۵
۱۷۔	مسافر خواہشیں	۳۷
۱۸۔	دست برداری کا لمحہ	۳۸

۱۹۔	دل کسی اور ہی امکان پہ آیا ہوا ہے	۳۹
۲۰۔	کانگڑی میں لوبان جلایا، برف میں شکر ڈالی ہے	۴۱
۲۱۔	خوشبو کی طرح گزر گیا ہے	۴۳
۲۲۔	ترے لبوں کی حلاوت مجھے بلاتی ہے	۴۵
۲۳۔	رات گئی، بات گئی، چھوڑیے	۴۷
۲۴۔	مٹی کا اک غبار جو سوئے فلک گیا	۴۹
۲۵۔	حرفِ جان سوز ہے پیرایۂ تشہیر نہیں	۵۱
۲۶۔	پسِ وصال ٹھکانے حواس جب آئے	۵۳
۲۷۔	سر ہی تھا غم میں خم ہوا اور خم ہی رہ گیا	۵۵
۲۸۔	فبای آلاء ربکما تکذبن	۵۷
۲۹۔	ایک لامحدود	۵۸
۳۰۔	اس بستی کے مکھیا	۵۹
۳۱۔	میں	۶۱
۳۲۔	اک ستارے نے مجھ سے کہا	۶۳
۳۳۔	جچا نہ کوئی بھی منصب نگاہ میں اپنی	۶۵
۳۴۔	برف پر آگ جلاتا ہوں، الجھ جاتا ہوں	۶۷
۳۵۔	جائے گا یہ روگ یہ آزار میرے ساتھ ہی	۶۹
۳۶۔	لہو میں عکسِ دیرینہ کی جھلمل ڈل سے آتی ہے	۷۱
۳۷۔	بت سمجھنے لگے سبھی مجھ کو	۷۳
۳۸۔	اب میں دیوانۂ دنیا ہوں نہ دیوانۂ خواب	۷۵
۳۹۔	مجھ کو جو شے پسند آئی تھی	۷۷
۴۰۔	سخن میں ہم نے دوراز کار پرکاری نہیں رکھی	۷۹
۴۱۔	زمینی بلائیں	۸۱
۴۲۔	صبر و رضا کا صحیفہ	۳۸

۴۳۔	مراجعت	۸۵
۴۴۔	بھونرا	۸۷
۴۵۔	ایسے مہکی ہوئی ہے بادِ شمال	۸۸
۴۶۔	خجل ہے صرفِ نظر سے بہارِ باغ کی چاپ	۸۹
۴۷۔	بڑھا کے ربط، مجھے خاک سے دیا کر کے	۹۱
۴۸۔	کچھ دن سے اک عجیب سی جھلمل ہے گاؤں میں	۹۳
۴۹۔	سب ختم ہو گیا مری وحشت نہیں گئی	۹۵
۵۰۔	نظمِ فطرت میں مساوات ہے اچھی خاصی	۹۷
۵۱۔	ہر قدم پر گم شدہ یادوں کا ویرانہ پڑے	۹۹
۵۲۔	ایک دریائے نہاں تھا، اب نہیں ہوں	۱۰۱
۵۳۔	رباعی	۱۰۳
۵۴۔	اس رت میں ہے ہوا بھی سفر سے گریز پا	۱۰۴
۵۵۔	جہانِ دیگر (فردیات)	۱۰۵

۵۶۔	چاہے دلی ہو وہ کہ بالا کوٹ	۱۰۷
۵۷۔	بہت ہے فرشِ زمیں، بام و در نہیں نہ سہی	۱۰۸
۵۸۔	سفیر احمد خان لغمانی کی یاد میں	۱۰۹
۵۹۔	شمس الرحمٰن کی یاد میں	۱۱۰
۶۰۔	کہیں چراغ کہیں خواب چھوڑ آیا ہوں	۱۱۱

۶۱۔	سانجھ سمے جب سب آشائیں سب سپنے مر جاتے ہیں	۱۱۲

اے مرے پروردگار!

مانا مرے دم سے ہے
رونقِ بزمِ جہاں
میرے لیے ہے زمیں
میرے لیے آسماں

میرے تصرف میں ہے
دہر کی ہر ایک شے
کوئی علاقہ بھی ہو
زیرِ قدم ہے مرے

اپنے ہی دل پر نہیں
میرا مگر اختیار
اے مرے پروردگار!

ڈوبنے والا تھا جب سوئے مدینہ دیکھا
میں نے ہر موج کے ماتھے پہ پسینہ دیکھا

گناہ گار ہُوں ، دہلیز پر بٹھا دیجے
مگر حضور! مری حاضری لگا دیجے

جو مانگتے ہیں عطا کیجیے انھیں دنیا
مہارِ ناقہ مرے ہاتھ میں تھما دیجے

کھڑا ہُوں سر کو جھکائے میں سب سے آخر میں
کسی سے یہ نہیں کہتا کہ راستہ دیجے

ہر ایک پل ہے مدینے میں شرحِ صدر کا باب
جو اِس سے پہلے پڑھا ہے وہ سب بھلا دیجے

ملے یہیں مری مٹی کو کوئی جائے قرار
حضورؐ ! ایسا کوئی سلسلہ بنا دیجے

آزار اٹھا کر بھی جلاتے ہیں چراغ
افتاد ہی ایسی ہے کہ بھاتے ہیں چراغ
زخموں سے بجائے خوں ، نکلتی ہے لَو
اشکوں کی جگہ آنکھ میں آتے ہیں چراغ

تری آنکھیں۔۔!
کسی پچھلے جنم کی نیکیاں ہیں

بھڑکتی آگ سے آخر اٹھایا نم میں نے
پھر اس کی لَو میں کیا رقص کوئی دم میں نے

یہی کہ چاہا کسی کو اور اس کو پا بھی لیا
لیا ہے کام محبت سے کتنا کم میں نے

بجا ہے ، آپ جو کہتے ہیں ''یہ کہا ہوتا''
یہی کہا تھا اسے میرے محترم! میں نے

میں کیا بتاؤں گا تاخیر کا سبب اُس کو
لیا نہیں ہے کہیں راستے میں دم میں نے

یہ اور بات بھرا ہے بدن میں سانس کے ساتھ
کیا ہے کچھ تو فضا سے غبار کم میں نے

یہ رات ہجر کی تم پر بھی آئی ہو گی ضرور
بدل دیے ہیں مگر معنیِ عدم میں نے

ہر شے ہے کائنات کی اس کے لباس میں
کچھ برف اور ڈالیے میرے گلاس میں

کچھ کو نشاطِ غم ہے تو کچھ کو غمِ نشاط
ہم میں سے کوئی بھی نہیں اپنے حواس میں

دیکھے تری نظر کے ہزاروں مسوّدے
ہم حاشیے میں ہیں نہ کسی اقتباس میں

ملبوس کر رہے ہیں نمایاں بدن کی آگ
گندم کی خو یہ آ گئی کیسے کپاس میں

سب سے الگ تھلگ میں تماشے میں محو تھا
مجھ سے لپٹ گئے کئی فتنے ہراس میں

اُن کی دعا ہوئی مری صورت میں مستجاب
نسلیں جو مر گئی ہیں محبت کی آس میں

وہ سمجھتا ہے اِس کنائے کو
پُل کی حاجت نہیں ہے سائے کو

میں جو کہتا ہوں کچھ نہیں ہو گا
آگ میں ڈال سب کی رائے کو

لے کے دو چسکیاں مرے کپ سے
شہد کر دے گا پھیکی چائے کو

کھل کے دیتا نہیں وہ داد کبھی
آگ لگ جائے اُس کی ''ہائے ''کو

تجھ کو دیکھا تو خود بدل لیں گے
صائب‌الرائے اپنی رائے کو

میں یہاں آخری مسافر ہوں
اک نظر دیکھ لوں سرائے کو

جو دل میں ہے وہ لبِ چشمِ تر نہیں آیا
میں خواب لے کے سرِ رہگزر نہیں آیا

لپٹ گیا صفِ اعدا میں گھس کے یار سے میں
وہ زعم تھا مجھے لشکر نظر نہیں آیا

میں دے رہا ہوں سرہانے کو طول بازو سے
ابھی ترا مرے سینے پہ سر نہیں آیا

اسی لیے تو یہ بستی ہے نامراد بہت
کسی کے کام کوئی وقت پر نہیں آیا

میں جل کے راکھ ہوا عشق میں مگر مجھ پر
کوئی بھی لمحۂ نامعتبر نہیں آیا

کہ جو سنے وہ کہے میرے دل کی بات کہی
مرے سخن میں ابھی وہ اثر نہیں آیا

مجھ کو جلتے شجر کے سائے میں جب بھی اُس نے بلایا ہوتا ہے
عین اُس وقت ہی ہمارے گھر کوئی مہمان آیا ہوتا ہے

تم یہاں آ گئے محبت میں،ٹھیک ہے! پھر بھی سوچ لو اک بار
اُس جگہ دھوپ بھی نہیں جاتی جس جگہ میرا سایہ ہوتا ہے☆

پہلے وہ اُس طرف اتر جائے جس کا اُس پار منتظر ہے کوئی
میں نے پھیلا لیے ہیں یوں بازو جس طرح پُل بنایا ہوتا ہے

مان لیتا ہے جب وہ بات مری ، مجھ سے پھر بات ہی نہیں ہوتی
اُس نے بھی اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپایا ہوتا ہے

جا نکلتا ہوں تیرے باغوں میں ، خواب میں چومتا ہوں پھولوں کو
صبح جب دیکھتا ہوں آئینہ ، زخم ہونٹوں پہ آیا ہوتا ہے

اُس سے کوئی گلہ نہیں احمدؔ ، وہ مدد کو اگر نہیں آیا
آسماں بھی نظر نہیں آتا ، سر پہ جب بوجھ اٹھایا ہوتا ہے

☆مخلص وجدانی کے نواح میں

میری وحشت جگمگائے گی زمیں کے آس پاس
اور میں رہ جاؤں گا تیری 'نہیں' کے آس پاس

انگلیوں کی مشعلوں میں لَو ہے اُس کے لمس کی
نور کا ہالہ کھنچا ہے آستیں کے آس پاس

ایک تشکیکِ حجاب آثار میرے خوں میں ہے
جس کا سایہ ہے کہیں میرے یقیں کے آس پاس

ہر نظر کو تھا عجب اک زعمِ تفہیمِ جمال
رہ گئے سب کارواں اُس کی جبیں کے آس پاس

ایک دو جائیں اگر دو چار آ جاتے ہیں اور
بھیڑ رہتی ہے ترے گوشہ نشیں کے آس پاس

کچھ غبارِ وقت میں ہیں کچھ برائے رفتگاں
کیسی کیسی بستیاں ہیں اس زمیں کے آس پاس

وہ شفق پھوٹی نگاہِ سرمگیں کے آس پاس
ہو گئے سب جمع اُس ناز آفریں کے آس پاس

جنوں میں یار سے آگے قدم نہ پڑ جائے
یہ عمر بھر کی ریاضت بھی کم نہ پڑ جائے

کچھ احتیاط ! مری آگ تاپنے والو
کسی کی آنکھ میں شعلے کا نم نہ پڑ جائے

مجھے یہ ڈر ہے مری رائیگاں دعاؤں سے
تمھاری تیغِ تغافل میں خم نہ پڑ جائے

یہ شہد و شعر دھرے کے دھرے نہ رہ جائیں
کہیں اسے کوئی کارِ اہم نہ پڑ جائے

یہ زندگی ہے کوئی اس کا اعتبار نہیں
کل اِس کا نام مضافِ عدم نہ پڑ جائے

میں اپنے دکھ میں نہیں مبتلا ، مجھے احمدؔ
یہ غم ہے اُس کو مذاقِ ستم نہ پڑ جائے

کسی بے انت جذبے کی نگہبانی میں رہتا ہوں
میں جتنا مضطرب ہوتا ہوں آسانی میں رہتا ہوں

اب اِن گلیوں میں مجھ کو گھومنا پڑتا ہے پہروں تک
تجھے جب تک نہ دیکھوں میں پریشانی میں رہتا ہوں

بتانا پڑ گیا تو کیا بتاؤں گا اُن آنکھوں کو
میں کیسی آگ میں جلتا ہوں، کس پانی میں رہتا ہوں

اسے کیسے بتاؤں میں کہ میرا ماجرا کیا ہے
وہ حیراں ہے کہ میں ہر وقت حیرانی میں رہتا ہوں

وہ میرے ہاتھ کی ریکھاؤں کا حسنِ تغیر ہے
ثباتِ عشق ہوں میں اس کی پیشانی میں رہتا ہوں

میں دکھ تھا ، دستِ قدرت نے مری تجسیم کر ڈالی
تمھارے درمیاں میں شکلِ انسانی میں رہتا ہوں

اپنے ہی اسیر ہو گئے ہیں
لو ! ہم بھی فقیر ہو گئے ہیں

اُس شخص کا کیا بنے گا جس کے
ہم جیسے مشیر ہو گئے ہیں

گزری ہے جدائی کی بس اک رات
ہم سیدھے تیر ہو گئے ہیں

ایجاد ہوئے ہیں ایسے آلات
بوڑھے بھی شریر ہو گئے ہیں

ماتھے کی شکن تھے جو کبھی وہ
ہاتھوں کی لکیر ہو گئے ہیں

نکلے گا خوشی کا وہ شمارہ
ہم جس کے مدیر ہو گئے ہیں

دیکھا ہے کسی نے ہنس کے احمدؔ
ہم کتنے امیر ہو گئے ہیں

صادقین ٹیڑھ

میں اک ویراں حویلی کے
شکستہ اور مرجھائے ہوئے زینے سے
اپنی پشت ٹیکے
صبح سے بیٹھا ہوا ہوں
دھوپ زینہ چڑھ کے
چھت پر جا چکی ہے
شام کے سائے
بھرے بازار کی جانب سے
خالی ہاتھ
میری سمت بڑھتے آ رہے ہیں

میں سبھی سے لاتعلق
ممکنہ حد تک خمیدہ دائیں گھٹنے
کے پرانے اور ناہموار گتّے پر دھرے
بالشت بھر کاغذ پہ پنسل سے
مسلسل رائیگانی لکھ رہا ہوں
لکھتے لکھتے
انگلیوں میں صاد قینی ٹیڑھ
آنکھوں میں لہو آنے لگا ہے

ہائے! افسوس!!

میں اِس شہر میں اجنبی ہوں
مرے ہاتھ پر
یہ جو اُلجھی ہوئی ایک تحریر ہے
اِس کا میری جبیں کے نوشتے سے کوئی علاقہ نہیں
اعتبارِ شواہد کے اِس آئینے سے
عدالت کا صرفِ نظر غیر ممکن سہی
چند سانسوں کی مہلت ہی دے دیجیے
سر سے بارِ امانت اترتے ہی
اک سانس اوپر
نہ اک سانس نیچے

میں لوٹ آؤں گا
قاضیِ شہر کی برگزیدہ خموشی کے عکس جلی میں
لرزتی ترازو کی ہیبت سوا ہو گئی
''کوئی ضامن؟ کہ جو اپنی گردن کو گروی رکھے؟''
ایک امید سانسوں میں پیوند ہونے لگی
''کوئی ضامن کہ جو۔۔۔۔۔!''
میری درخواست ہرزہ پھری
اور بے دستخط میرے پاس آ گئی
اِس بھرے شہر میں
سارے کردار موجود ہیں
بس نہیں ہے تو کوئی ابوذرؓ نہیں
کیسی روشن کشادہ جبینیں ہیں
لیکن کسی پر
کسی دوسرے کے دکھوں کا پسینہ نہیں
یہ مدینہ نہیں

مسافر خواہشیں

پھر وہی گھائل ستارا
زندگی کا استعارہ
ابر پارے کی گرہ سے
میری جانب جھانکتا ہے
پھر پہاڑوں سے اترتے راستے
میری مسافر خواہشوں سے بھر گئے ہیں
کم سن و شاداب پگڈنڈی
پلٹ کر میرے دل تک آ گئی ہے
لہلہاتے کھیت سے
نظموں کے خوشے چنتے چنتے
شام گہری ہو گئی ہے
دور افق پر
خامشی کے پیڑ کی رنگت سنہری ہو گئی ہے

دست برداری کا لمحہ

رائیگانی کی
پُر پیچ پگڈنڈیوں پر سفر کرتے کرتے
سبھی کی کھڑاؤں میں بل آ گیا
ایڑیوں میں دھنسی
سخت نوکیلی کیلوں کے منہ مُڑ گئے
گودڑی گرد سے اَٹ گئی
دست بردار ہونے کا وقت آ گیا
میں نے اپنی کھڑاؤں میں
سیڑھی لگائی
پکارا
کہ ہے کوئی
جس کی میں نصرت کروں

دل کسی اور ہی امکان پہ آیا ہوا ہے
وقت کیسا مرے ایمان پہ آیا ہوا ہے

آنے والا ہے یقیناً کوئی مہمانِ عزیز
ابر پارہ مرے دالان پہ آیا ہوا ہے

موسمِ ذات کی شدت کا نہ پوچھو احوال
دکھ کا سورج خطِ سرطان پہ آیا ہوا ہے

کتنے صحرا مری وحشت کی طرف دیکھتے ہیں
فیصلہ میرے گریبان پہ آیا ہوا ہے

اب مجھے ہاتھ بٹانا ہی پڑے گا اس کا
وہ سراسر مرے نقصان پہ آیا ہوا ہے

تُو نے تَو ڈھانپ دیا اپنا خدا چادر سے
میرا آنسو مرے دامان پہ آیا ہوا ہے

کانگڑی میں لوبان جلایا، برف میں شکر ڈالی ہے
اُڑتی سی اک بات سنی تھی کیا کیا آس لگا لی ہے

اجلی دھوپ کی نرمی کاڑھی سرما رُت کی چادر میں
بانکی ٹیڑھی پگڈنڈی کی سیدھی مانگ نکالی ہے

میری آنکھوں سے جو ہو کر اُس کے گھر تک جاتا ہے
اس رستے پر گھاس اگنے دوں یہ تو سیدھی گالی ہے

خون پسینہ ایک کیا ہے دن بھر میں نے کھیتوں میں
میرے ہاتھ کی ریکھاؤں میں میل نہیں ہریالی ہے

بچے بھی گل دستے لے کر صبح سے دھوپ میں بیٹھے ہیں
میں ہی ضرورت مند نہیں ہوں سارا شہر سوالی ہے

گھر کے خالی کمروں میں بھی جن کی کوئی جگہ نہیں
میرے ذمے کچھ ایسی ہی چیزوں کی رکھوالی ہے

خوشبو کی طرح گزر گیا ہے
وہ سب سے ہاتھ کر گیا ہے

ڈرتے نہیں لوگ بد دعا سے
تُو میری دعا سے ڈر گیا ہے؟

اک آس چلی تھی صبح گھر سے
اک رنج پلٹ کے گھر گیا ہے

وہ حال ہوا ہے ظالموں کا
مظلوم خدا سے ڈر گیا ہے

شانوں سے یہ دھوپ بھی اتاروں
سینے سے تو بوجھ اتر گیا ہے

لے سانس کبھی تو سکھ کا احمدؔ
ظالم! تُو بہت بکھر گیا ہے

ترے لبوں کی حلاوت مجھے بلاتی ہے
کوئی عجیب سعادت مجھے بلاتی ہے

یہ شامِ شہر تو آلودۂ تصرف ہے
دیارِ دور کی فرصت مجھے بلاتی ہے

وہ جس کے لطف نے چھوڑا نہیں کہیں کا مجھے
اسی گلی کی ندامت مجھے بلاتی ہے

اب اور کوئی مجھے یاد ہی نہیں کرتا
کبھی کبھی مری وحشت مجھے بلاتی ہے

لواخ ہو گئے روشن غزہ کے باغوں میں
کلی کلی پئے نصرت مجھے بلاتی ہے

بہت بلیغ ہے یہ سرخیِ شفق احمدؔ
اجڑ گئی جو وِلایت مجھے بلاتی ہے

رات گئی بات گئی چھوڑیے
یہ مری اوقات نہ تھی چھوڑیے

ایک فقط میں ہی نہیں نامراد
اور بھی ہیں مجھ سے کئی چھوڑیے

سر پہ اٹھایا میں یونہی آسمان
تم نے بھی آواز نہ دی ''چھوڑیے!''

ایک ہی دھن سر میں سمائی ہوئی
یوں ہے تو پھر یوں ہی سہی چھوڑیے

چھوڑ دیا ہم نے سبھی کچھ مگر
کیسے یہ ویران گلی چھوڑیے

مٹی کا اک غبار جو سوئے فلک گیا
اک بار تو خود اپنی طرف میرا شک گیا

سایہ ہے اُس پہ وصل کی خواہش کے خوف کا
لیکن اگر کہیں کوئی غنچہ چٹک گیا!

چاروں طرف سے خون کے چشمے ابل پڑے
سایہ مرے وجود کے اندر سرک گیا

میری بھی تھوڑی حوصلہ افزائی ہو گئی
جاتے ہوئے وہ میرا بھی شانہ تھپک گیا

میری کشش میں کوئی کجی تو ضرور ہے
جو بھی مرے حصار میں آیا ، بھٹک گیا

احمدؔ میں پہلے عشق کو سمجھا تھا آخری
یہ سلسلہ چلا تو بہت دور تک گیا

حرفِ جاں سوز ہے ، پیرایۂ تشہیر نہیں
میرا قصہ ہے یہ روداد جہانگیر نہیں

سیکھ لے تُو بھی کوئی رمز،کوئی نکتہ کہ میں
وہ پڑھاتا ہوں کتابوں میں جو تحریر نہیں

مجھ پہ واجب ہے سو کرتا ہوں تگ و دو ورنہ
جو مرے پاس ہے وہ حاصلِ تدبیر نہیں

میں نے دیکھی ہے تری آنکھوں میں صورت اپنی
میرے پیروں میں کوئی اور تو زنجیر نہیں

مجھ سے سرزد ہوا اس عشق میں وہ جرم کہ جو
قابلِ عفو نہیں ، لائقِ تعزیر نہیں

پسِ وصال ٹھکانے حواس جب آئے
تو اس نے مجھ سے یہ پوچھا کہ آپ کب آئے

قبول کرتی نہ تھی ذائقوں کی آگ مجھے
پھر ایک دن کسی ایسی دعا پہ لب آئے

کیا نہ آ کے بھی احساں کہ رہ گئی مری شرم
میں اس سے کیسے یہ کہتا کہ تم بھی اب آئے

بلا سبب نہیں مڑ مڑ کے دیکھنا میرا
پلٹ کے دیکھ! مجھے دیکھنے کا ڈھب آئے

کسی نے خیمے سے جھانکا تو اونٹ بیٹھ گئے
کہیں کے بھی نہ رہے وہ جو بے طلب آئے

حدیثِ نفس ہی کہیے اسے جو نام کے ساتھ
کسی کا عہدہ ، کسی کا حسب نسب آئے

سر ہی تھا غم میں خم ہوا اور خم ہی رہ گیا
سوکھے شجر پہ ماتمی پرچم ہی رہ گیا

نکلی صدا جو منہ سے وہ ہونٹوں پہ جم گئی
ایک اَن کہی کا عالمِ پیہم ہی رہ گیا

اس میں ہیں عکس و نقشِ حجابات و افتخار
ماضی کی دھجیوں کا یہ البم ہی رہ گیا

اب کیا کریدتا ہے یہ عجلت پسند وقت
گزری رتوں کا راکھ میں جب نم ہی رہ گیا

جس کو نکھارتی تھی ترے ناخنوں کی آنچ
اس زخم پر بھی وقت کا مرہم ہی رہ گیا

میں سحرِ آبروئے معانی کی کھوج میں
نکلا تو لفظِ کم سے بھی کچھ کم ہی رہ گیا

فَبِأَیِّ آلَآ ءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّ بَانِ

شکر ہے
تم ذہن پڑھ سکتے نہیں
ورنہ یہ چولہا سرد ہو جاتا
مرے ماتھے کے اِس الٹے توے پر
پھوٹتے اور ٹوٹتے
یہ آبِ نمکیں کے شرارہ خیز قطرے
توبہ توبہ۔۔۔۔!
شکر ہے
تم ذہن پڑھ سکتے نہیں
آنکھوں کی حجت مان لیتے ہو

ایک لامحدود

کلائی پر بندھے
اوقاتِ بے مصرف کے آلے کو
تلائی کے تلے رکھا
ہتھیلی گال کے نیچے کشادہ کی
سرہانہ سر کے نیچے سے اٹھا کر
سر پہ رکھا
دونوں گھٹنے پیٹ سے جوڑے
غمِ دنیا کے دفتر کو سمیٹا
راحتِ محدود کا عادی بدن
بستر پہ چھوڑا
ایک لامحدود میں پہنچا
جہاں ہر چیز ممکن ہے

اس بستی کے مکھیا

یہ کج عقائد کے پہاڑوں میں گھری
بے نام بستی
جو ستاروں سے مزین آسماں پر
تہمتیں دھرتے نہ ڈرتی تھی
کسی عیسیٰ نفس کی منتظر ہے
آسمانوں سے اترتے نوری زینے

دیر سے ویراں پڑے ہیں
وہ مضافاتی گداگر
جن کی فہم نارسا کے چاک پر
ایسے معلق باغ بنتے ہیں

جو مر کر بھی نہیں ملتے
اب اِس بستی کے مکھیا ہیں
دیے کی لَو لپیٹی جا چکی ہے
روزنوں پر سخت پہرہ ہے
گلی کوچوں میں بنجر ہاتھ دہشت بو رہے ہیں
یہ وہ بستی ہے
کہ جس میں دھوپ بھی نکلے
تو کتّے بھونکتے ہیں۔

میں

برس دو برس تک
مرا نام ایلان کردی رہا ہے
مگر اب مرے سینکڑوں نام ہیں
میں فلسطین کا مصطفیٰ ہوں
پشاور کا گُل شیر ہوں
میں نے بڈگام میں جان دی تھی
مری قبر بغداد میں ہے
کہیں میں روہنگیا
کہیں پنڈتوں میں گھرا محض اک آدمی ہوں
پشاور کے اسکول میں
جو عبارت مرے خوں سے لکھی گئی

اس کے معنی کسی پر نہیں کھل سکے
مجھ پہ کابل کی مسجد میں اس وقت حملہ ہوا
جب میں سجدے میں تھا
شام کی سرحدوں پر
مرا قافلہ لٹ گیا
دیکھنے والے بس دیکھتے رہ گئے

راستے بند ہیں
کوئی دروازہ کھلتا نہیں
جس کا اپنا ہی گھر
اس کا مقتل ہو
ظالم زمانے سے بچ کر
زمانے میں آخر کہاں جائے گا

جانتا ہوں
کہ میرا لہو رائیگاں جائے گا

اک ستارے نے مجھ سے کہا
آپ مجھ سے مخاطب ہیں کیا

اُس نے ہونٹوں پہ انگلی رکھی
اور میں دیکھتا رہ گیا

آئنہ لے کے آئے سبھی
کوئی لایا نہیں ہے دیا

وہ مرے ہاتھ کی پشت پر
میری تقدیر لکھتا رہا

کیا بتاؤں گا احباب کو
یہ اچانک ہمیں کیا ہوا

تم کسی بات پر ہنس دیے
اور موسم بدلنے لگا

میں یہ سمجھا کہ میں ہوں مگر
میں نہیں وہ کوئی اور تھا

کیا بتاؤں اندھیروں کو میں
جو چراغوں کی لَو سے ہوا ؟

بے خیالی بڑی چیز ہے
میں نے آخر اسے چھو لیا

جچا نہ کوئی بھی منصب نگاہ میں اپنی
میں آ گیا ہوں پلٹ کر پناہ میں اپنی

ہزار نذر کرے اپنی کائنات کوئی
کسی کو بار نہ دوں بارگاہ میں اپنی

خود آگہی کے شہیدوں میں ہو شمار مرا
میں اپنی جان سے جاؤں تو راہ میں اپنی

کوئی نہ دیکھے یہ عجز و نیاز کے پیوند
لگا رکھے ہیں جو میں نے کلاہ میں اپنی

لڑا ہوں اور اکیلا لڑا ہوں اپنے خلاف
کوئی عدو تھا نہ کوئی سپاہ میں اپنی

اسے بھی اپنے کیے پر خوشی ہوئی لیکن
مزا ملا جو مجھے واہ واہ میں اپنی

برف پر آگ جلاتا ہُوں ، الجھ جاتا ہوں
وہی ماحول بناتا ہُوں ، الجھ جاتا ہوں

کتنے آباد ہیں یہ دونوں کنارے میرے
اک ذرا موج میں آتا ہُوں ، الجھ جاتا ہوں

میں بنا لیتا ہُوں بابل کے معلق باغات
تیری تصویر بناتا ہُوں ، الجھ جاتا ہوں

اب ہے یہ فکر کہ ہو اُس کی تواضع کیسے
شہد ہر شے میں ملاتا ہُوں ، الجھ جاتا ہوں

یہ نہ ہو تجھ کو نظر آئے بس اپنی صورت
آئنہ تجھ کو دکھاتا ہوں ، الجھ جاتا ہوں

میرے ہاتھوں سے چپک جاتے ہیں اک خوف کے سانس
پاؤں سے چاک گھماتا ہُوں ، الجھ جاتا ہوں

جائے گا یہ روگ ، یہ آزار میرے ساتھ ہی
ختم ہو جائیں گے یہ آثار میرے ساتھ ہی

پہلے مجھ سے دیر تک اٹھکیلیاں کرتی رہی
چل پڑی پھر راہ کی دیوار میرے ساتھ ہی

آئے تھے ناصح کہ سمجھا کر مجھے لے جائیں گے
رہ گئے پھر دشت میں دو چار میرے ساتھ ہی

جاگتے ہی پھر وہی،سونے سے پہلے کی للک
ایک فتنہ ہو گیا بیدار میرے ساتھ ہی

میں نے لیکن اس لجاجت سے کیا اظہارِ عشق
اس کو کرنا پڑ گئی تکرار میرے ساتھ ہی

لہو میں عکسِ دیرینہ کی جھلمل ڈَل سے آتی ہے
ہم اُس خوشبو میں رہتے ہیں جو حضرت بل سے آتی ہے

نگہ دارِ اخوت ہیں جواں ادھڑے ہوئے سینے
یہ کیسی سرخرو مٹی ہے جو مقتل سے آتی ہے

نکل سکتے ہیں استصوابِ رائے سے کئی رستے
عدو کو موت لیکن مسئلے کے حل سے آتی ہے

مگر اقوامِ عالم کی گراں گوشی نہیں جاتی
لہو کی چاپ ورنہ ہر گزرتے پل سے آتی ہے

کوئی آواز پیہم وقت کی اوجھل سے آتی ہے
نویدِ صبحِ نصرت آنے والے کل سے آتی ہے

بُت سمجھنے لگے سبھی مجھ کو
دیکھ اب تو مرے سخی مجھ کو

یا تو مٹی ہی بھربھری ہے مری
یا کوئی دکھ ہے واقعی مجھ کو

میں جسے ڈھونڈتا ہوں مدت سے
مل نہ جائے کہیں وہی مجھ کو

دو قدم بھی نہ ساتھ جس نے دیا
دور تک لے گیا وہی مجھ کو

پاؤں پانی میں سر ہے پتھر پر
یہ کہاں نیند آ گئی مجھ کو

دکھ سے دیکھا تھا میں نے خواب کبھی
جس کی ہے آج تک خوشی مجھ کو

مار ڈالے گی ایک دن احمدؔ
میری آنکھوں کی یہ نمی مجھ کو

اب میں دیوانۂ دنیا ہوں نہ دیوانۂ خواب
میرے ذمے ہے نگہبانیِ ویرانۂ خواب

جس پہ اترا ہی نہیں غم کا صحیفہ کوئی
مجھ سے وہ خاک سنے گا مرا افسانۂ خواب

یہ بھی ممکن ہے کرے حسبِ تقاضا ہی سلوک
مجھ سے شائستۂ وحشت سے وہ بے گانۂ خواب

دو مقامات ہیں زیبائیِ عالم کے کفیل
اک تری بزم ہے اک میرا پری خانۂ خواب

یہ ترے ہونٹ ، یہ رخسار ، یہ آنکھیں ، یہ جبیں
عرصۂ خواب سے باہر بھی ہے مے خانۂ خواب

مجھ کو جو شے پسند آئی تھی
آگ تھی،آگ بھی پرائی تھی

جب بغاوت ہوئی تھی زنداں میں
عین اسی دن مری رہائی تھی

اُس پہ ابلاغِ خامشی نہ ہوا
میں نے ہر بات اسے بتائی تھی

بانٹ دی ہے وہ آگ لوگوں میں
دیوتاؤں سے جو چرائی تھی

کتنی مشکل سے اپنے خوابوں میں
میں نے اپنی جگہ بنائی تھی

اپنے بستر پہ تھا جب آنکھ کھلی
ہاتھ میں رات کی کلائی تھی

جو جسے چاہتا تھا ، پا لیتا
اے خدا! اِس میں کیا برائی تھی

سخن میں ہم نے دور از کار پُرکاری نہیں رکھی
یہ کم ہے کیا ، نظر میں گرم بازاری نہیں رکھی

پہنچ جاتا ہوں میں خود ہی جہاں بھی آگ ہوتی ہے
کسی نے لا کے پلکوں پر یہ چنگاری نہیں رکھی

اُنھیں معلوم تھا میں فالتو دکھ جمع کر لوں گا
مرے بابا نے گھر میں کوئی الماری نہیں رکھی

شبِ غم کاٹنے کی اک سے اک تدبیر کر لی تھی
مگر اِس ساعتِ وصلت کی تیاری نہیں رکھی

کہ جس کا ہاتھ آئے ہاتھ میں اُس سے لپٹ جاؤں
اب ایسی بھی تو رستے میں وفاداری نہیں رکھی

شکستِ عہد جیسے سانحے کے بعد بھی تجھ سے
محبت ٹوٹ کر کی ہے مگر طاری نہیں رکھی

زمینی بلائیں

یہ اندھی گھپائیں
کبھی جن کی جھلمل سے
تاریک رستوں کی راتیں سنورتی رہی ہیں
کبھی جن کے مبہم اشاروں کی ترتیب
ناقہ سواروں کا رخ موڑتی تھی
جنھیں آسمانِ زمیں کی جبیں پر سجایا گیا تھا
یہ اندھی گھپائیں
اب اپنے ہی ہم جنس روشن ستاروں کے
پیچھے پڑی ہیں
ان اندھی گھپاؤں کی ہیئت سمجھنا بہت ہی کٹھن تھا

مگر ہم نے پیمانۂ نور سے
فاصلوں کا تعین کیا
ان گھپاؤں کا قد کاٹھ ناپا
مگر اے خدا!
ربِ کون و مکاں! خالقِ انس و جاں!
یہ زمیں اور اس کی سراپا شکم یہ گھپائیں
جو چاروں دشاؤں میں پھیلی ہوئی ہیں
انھیں کون جانے
انھیں کون سمجھے
مجھے کوئی نوری اشارہ ملے
ذہن کچھ کام کرتا نہیں
یہ زمینی گھپائیں تو ایسی بلائیں ہیں
جن کے شکم کا جہنم
کسی شے سے بھرتا نہیں

صبر و رضا کا صحیفہ

صبحِ کاذب نے اپنی سیاہی سمیٹی
محلے کی مسجد سے سحرِ سحر میں
موذن کی آواز کا رس گھلا
اُس نے سیلن زدہ فرش پر سے
لڑھکتے اندھیرے میں لپٹے ہوئے
ایک نوزائیدہ حرفِ مبہم کو
تسبیحِ شکر و رضا میں رکھا
حرفِ نوزائیدہ کو معانی ملے
بے کسی کا عجب محترم ایک سایہ تھا
جس کی خموشی میں

صبر و رضا کے صحیفے کی آیات جلتی رہیں
رشکِ ققنس مگر اپنی ہی راکھ سے
پھر نکلتی
یہاں تک کہ وہ جو کبھی حرفِ نامعتبر تھا
اسے اعتبار و محبت کی صد رنگ چادر میں
لپٹا ہوا
صبحِ صادق کی دہلیز پر سب نے دیکھا
تحیر زدہ بستیوں کو یہ معلوم ہو
ماں صحیفہ تھی
صبر و رضا کا صحیفہ
زمیں پر جسے آسماں سے اتارا گیا تھا

مراجعت

میں دیکھنے لگا تھا پسِ اعتبارِ جسم
میرا یہ اجتہادِ نظر مجھ کو کھا گیا
اک بے نشاط قرب سے آگے کا یہ فسوں
ایسا رگوں میں اترا مری جاں کو آ گیا

کچھ ماورائے وصل بھی درکار تھا مجھے
میں اک طلسمِ ہوش ربا کے سفر میں تھا
حاصل تھا جو ، حصول اسی کا تھا مدعا
اک زخم تھا سماعِ طلب ، عمر بھر رہا

کل بھی دکھائی دے جسے عشرِ عشیرِ جزو
وہ کیا کرے جو اپنی نظر کا اسیر ہو
بل کھا کے ایک موڑ سے رستہ پلٹ گیا
''پہنچے وہاں ہی خاک جہاں کا خمیر ہو''

☆مرزا جواں بخت جہاں دار

بھونرا

آوارہ اڑنے کی دھن میں
بیٹھے بٹھائے
تاریکی میں
کمرے کے اک کونے سے یہ
اپنی غرض کے سائے سائے
باہر آئے
پَر پھیلائے
اندازوں کے تیر چلائے
اُڑتا جائے
دائیں بائیں ٹھوکر کھائے
چلتے پنکھے سے ٹکرائے
کوڑے کرکٹ میں مل جائے

ایسے مہکی ہوئی ہے بادِ شمال
تم کہیں جیسے مسکرائے ہو
بیل دیکھی شجر سے لپٹی ہوئی
آج تم کتنے یاد آئے ہو

خَجِل ہے صرفِ نظر سے بہارِ باغ کی چاپ
لگی ہے دل سے کسی یارِ بد دماغ کی چاپ

کبھی نہ اتری کسی دور کے مسافر پر
تری نظر کی حَلاوت،ترے ایاغ کی چاپ

بتا رہے ہیں یہ جھلمل کنائے تاروں کے
سنی گئی ہے کہیں میرے دل کے داغ کی چاپ

ضرور آئے گا اس دشتِ تیرگی میں کوئی
سنائی دیتی ہے مجھ کو کسی چراغ کی چاپ

سنبھل کے سوچ عناصر ہیں گھات میں احمدؔ
پہنچ نہ جائے فلک سے پرے دماغ کی چاپ

بڑھا کے ربط، مجھے خاک سے دیا کر کے
وہ چھوڑ دے گا محبت میں مبتلا کر کے

مجھے تلاش ہے جس کی وہ آج بھی نہ ملے
میں روز گھر سے نکلتا ہوں یہ دعا کر کے

وہی خوشی تو ہمارے دکھوں کی ہے بنیاد
جو ہم نے پائی کسی اور کو خفا کر کے

پھرے نہ شعر کی تاثیر سے بھی جن کے قلوب
دکھاؤں اُن کو میں کیا اور معجزہ کر کے

بزرگ بحث میں الجھے ہوئے ہیں یوں جیسے
اٹھیں گے آج مگر کوئی فیصلہ کر کے

کچھ دن سے اک عجیب سی جھلمل ہے گاؤں میں
جلنے لگی ہے آگ پہاڑی گھپاؤں میں

یہ کائنات بھی مری سازش میں ہو شریک
سیڑھی لگا رہا ہوں میں ٹوٹی کھڑاؤں میں

آئینے وَہم کار ہیں ، عریاں نہیں ہے وہ
پوشاکِ شب بدن پہ ہے ، شبنم ہے پاؤں میں

ڈر ہے خدا سے مانگ نہ لوں تجھ کو میں کہیں
تاثیر آ گئی ہے بلا کی دعاؤں میں

آتے نہیں ہیں حسنِ غزل تک معاملات
مر جاؤں گا میں نظمِ تعلق کی چھاؤں میں

کہتا ہے ''مت ملے کوئی احمدؔ حسین سے
کم بخت ڈال دیتا ہے زنجیر پاؤں میں''

سب ختم ہو گیا مری وحشت نہیں گئی
مڑ مڑ کے دیکھنے کی یہ عادت نہیں گئی

آ بیٹھتی ہیں اب مرے ہاتھوں پہ تتلیاں
پوروں سے اُس کے لمس کی لذت نہیں گئی

لیکن خدا کا شکر ہے اِس ہاؤ ہُو میں بھی
اک دوسرے سے تھی جو شکایت نہیں گئی

قائل نہیں تصرفِ بے جا کا وصل میں
ایسی بھی رائیگاں یہ وضاحت نہیں گئی

اِس مصلحت کی خیر ، نہیں جس کا کوئی انت
میں مٹ گیا ہوں آپ کی حکمت نہیں گئی

نظمِ فطرت میں مساوات ہے اچھی خاصی
وہ بھی اب محوِ مناجات ہے اچھی خاصی

ایک مدت سے ہمارے ہی معطل ہیں حواس
ورنہ ہر بات نئی بات ہے اچھی خاصی

وہ جو کڑھتی ہے شب و روز کے ہنگاموں پر
خود بھی اک وجہِ فسادات ہے اچھی خاصی

یہ جو مُڑ مُڑ کے تجھے دیکھ رہا ہوں میں بھی
تجھ میں اے شخص کوئی بات ہے اچھی خاصی

وہ محبت میں گرفتار ہوا ہے تو کُھلا
یہ زمیں دارِ مکافات ہے اچھی خاصی

دیکھ لیتا ہے گزرتے ہوئے وہ ایک نظر
ہم فقیروں کی بھی اوقات ہے اچھی خاصی

میرؔ صاحب ہی بھلے تھے انھیں احساس تو تھا
شہر میں عزتِ سادات ہے اچھی خاصی

ہر قدم پر گم شدہ یادوں کا ویرانہ پڑے
اور مجھ کو راستے سے لوٹ کر آنا پڑے

بے خیالی میں ہو سرزد معرکہ کوئی عجیب
بعد میں چاہے ہمیں اے دوست ! پچھتانا پڑے

کیا ہے تہذیبِ جنوں یہ معرفت تو ہو تجھے
تیرے پیچھے مجھ سے بڑھ کر کوئی دیوانہ پڑے

کم پڑے بہرِ تلافی جو ترے دامن میں ہے
زندگی! تجھ پر مرے خوابوں کا ہرجانہ پڑے

کوئی میرا نام لے کر دور سے آواز دے
اور ننگے پاؤں اُس کو دوڑ کر جانا پڑے

دوستوں کا کیا ہے احمدؔ جب پکارا آ گئے
کوئی ایسا بھی ہو جس کو ڈھونڈ کر لانا پڑے

ایک دریائے نہاں تھا ، اب نہیں ہوں
میں کہ ہونے کا گماں تھا ، اب نہیں ہوں

اس محبت نے مری تہذیب کر دی
میں ہراسِ دو جہاں تھا ، اب نہیں ہوں

آتشِ افروختہ تھا سر بسر میں
کیسا آشفتہ جواں تھا ، اب نہیں ہوں

اک ستارا تھا کسی اُلٹے توے کا
میں نمودِ رائیگاں تھا ، اب نہیں ہوں

ایک دن وہ لوٹ ہی آئے گا لیکن
سر بہ زانو میں جہاں تھا ، اب نہیں ہوں

یہ شعورِ رنگ و بو جس نے دیا ہے
میں وہی جاتی خزاں تھا ، اب نہیں ہوں

سارے پیرائے مری تخفیف کے تھے
میں ابھی احمد یہاں تھا ، اب نہیں ہوں

رباعی

پیشانیِ گردوں سے زمیں پر آئی
پاتال کے سینے سے ابھر کر آئی
ملنے کو ملی مجھے ہر اک چیز مگر
یوں ہے کہ کشش کھو کے میسر آئی

اِس رُت میں ہے ہَوا بھی سفر سے گریز پا
اِس رُت میں تَو سفر کا ارادہ نہ باندھیے
مثلِ ہلال ہوں میں افق پر ذرا سی دیر
مجھ سے توقعات زیادہ نہ باندھیے

جہانِ دیگر

بہت ہی کم سمجھتے ہیں
مگر جو ہم سمجھتے ہیں

☆

منصب اگرچہ یہ مرے قد سے بلند ہے
اِس آگ کو مگر مری مٹی پسند ہے

☆

مجھ کو کتنے غموں نے گھیرا ہے
تو کہاں ہے ؟ بہت اندھیرا ہے

☆

بس اک ہجوم ہے ، پنجوں پر ایستادہ ہجوم
سمجھ میں کچھ نہیں آتا معاملہ کیا ہے

☆

مثلِ سراب کرتی ہے موہوم سے ظہور
جلتے ہوئے درخت کا سایہ ہے زندگی

☆

بندھی ہے گردشِ افلاک میرے سانسوں سے
یہاں میں اپنے کسی کام سے نہیں آیا

☆

سب قاصدوں کو پھیر دیا تو نے خالی ہاتھ
بس اب تو بادشاہ سلامت ہی رہ گئے

☆

تو کیا یہ سچ ہے کہ ان قافلوں میں ہم بھی تھے
جو گھر سے نکلے مگر طورخم نہیں پہنچے

☆

اسی لیے تو مرا رقص والہانہ ہے
کہ یہ گلی نہیں بندوق کا دہانہ ہے

☆

روشنی مجھ تک مری محدود ہو کر رہ گئی
میری دھیمی لَو پہ اتنے ہاتھ پھیلائے گئے

☆

الجھا ہوا دن ہو کہ سلگتی ہوئی شب ہو
جو تیری مشیت ہے وہی میری طلب ہو

☆

میں ان کا سہارا ہوں جنھیں دشتِ بلا میں
سوکھے ہوئے اک پیڑ کا سایہ بھی بہت ہے

☆

کوئی بھروسہ نہیں ، میرا کوئی ٹھیک نہیں
میں دوڑتا ہوں مگر دوڑ میں شریک نہیں

☆

آٹھ اکتوبر ۲۰۰۵

چاہے دلی ہو وہ کہ بالاکوٹ
شہر اجڑے تو استعارے ہوئے

بہت ہے فرشِ زمیں ، بام و در نہیں ، نہ سہی
یہ کائنات مرا گھر ہے ، گھر نہیں ، نہ سہی

ہوا کے جیسے ہیں اپنے معاملات سبھی
اب اپنا کوئی اگر ہم سفر نہیں ، نہ سہی

اب اپنے شہر میں اپنا تو اور کچھ بھی نہیں
بس ایک خیمہ ہے ، یہ بھی اگر نہیں ، نہ سہی

چنے ہیں ملبے سے کتنے کُھلے ہوئے بستے
ہمارے ہاتھ میں کوئی ہنر نہیں ، نہ سہی

پڑی ہے برف تو خود ہی پگھل بھی جائے گی
اب اپنی راکھ میں کوئی شرر نہیں، نہ سہی

سفیر احمد لغمانی کی یاد میں

(میرا دوست جو آٹھ اکتوبر کے زلزلے میں بچھڑ گیا)

تجھے خبر تھی میں انکار کر نہیں سکتا
تُو مجھ سے مانگتا سانسیں ادھار میرے یار

زمیں کا زخم خزانے سے بھر دیا لیکن
زمیں کو پھر بھی نہ آیا قرار میرے یار

مگر وہ تھا ہی نہیں اس لیے نہیں بولا
میں چیختا رہا، مجھ کو پکار میرے یار

کسے خبر تھی کہ میرے وہاں پہنچنے تک
تُو اوڑھ لے گا یہ گرد و غبار میرے یار

مکان اپنے ہی ملبے تلے دبے ہوئے تھے
نہ شہر تھا نہ کوئی شہر یار میرے یار

شمس الرحمٰن کی یاد میں

خواب دفنانا کوئی آساں نہیں تھا
میں نے لیکن یہ گھڑی دیکھی ہوئی ہے
انگلیوں سے میں نے کھودی تھی لحد سی
ناخنوں میں دکھ کی مٹی بھر گئی ہے
اختصارِ داستانِ غم یہی ہے
پہلے وہ تھا اور اب اس کی کمی ہے

کہیں چراغ کہیں خواب چھوڑ آیا ہوں
میں گاؤں میں سبھی اسباب چھوڑ آیا ہوں

سمیٹ لایا ہوں آنکھوں میں ساری ویرانی
میں فصلِ گریہ کو شاداب چھوڑ آیا ہوں

جوان ہو گئی ہو گی اداس پگڈنڈی
پہاڑ پر جسے بے تاب چھوڑ آیا ہوں

پکارتے رہے ٹوٹے ہوئے کھلونے مجھے
میں بچپنے کے سب احباب چھوڑ آیا ہوں

کسی گلی میں پڑی رہ گئی کتابِ حیات
کسی میں بستہ و آداب چھوڑ آیا ہوں

برنگِ دگر

سانجھ سمے جب سب آشائیں،سب سپنے مر جاتے ہیں
ہم مورکھ بھی اپنا کاسہ گدڑی پر دھر جاتے ہیں

دھیان کے دیپ کی مدھم لَو میں امبر جیسی شکتی ہے
لیکن ایسے شانت سمے ہم خود ہی سے ڈر جاتے ہیں

کس کا دوش تھا،کس کے کارن،یُدھ میں ہم کو مات ہوئی
بھید یہ کُھل جائے اب چاہے جتنے بھی سر جاتے ہیں

ہم بنجارے، پریت کے مارے،گلیوں گلیوں گھومیں گے
جن کا گھر ہوتا ہے احمدؔ لوٹ کے وہ گھر جاتے ہیں

احمد حسین مجاہد سے میرا کم و بیش ایک ربع صدی کا تعلق ہے۔ ان کی اولین دور کی شاعری میں نے کشمیر کے دوسرے دوستوں کے ساتھ مظفر آباد اور ہزارہ کے چھوٹے بڑے شہروں، قصبوں میں کئی بار سنی ہے۔ یہ چائے کے ٹھیلوں، دوستوں کے چھوٹے بڑے کمروں، مشاعروں اور سفر کرتے ہوئے سنی اور ہر بار لطف اندوز ہوا۔ یہ انھیں صدارتی ایوارڈ ملنے سے کہیں پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں کی یادوں میں احمد حسین مجاہد کا سرتا پا شاعر ہونا، اپنی ماں بولی میں گفتگو کرتے چلے جانا اور دوستوں میں ایک اندازِ دلبری قائم رکھنا شامل ہے۔ مکانی فاصلوں کی وجہ سے ہمارے رابطوں میں خلل بھی پڑتا رہا مگر محبت بھرا اعتماد ہمیشہ قائم رہا۔ اس سارے عرصے میں ان کی چیدہ چیدہ غزلیں اور نظمیں پڑھنے اور سننے کا موقع بھی ملتا رہا مگر پچھلے کئی برس کی تخلیقات کو یک جا دیکھ کر ایک گونہ مسرت کا احساس ہوا۔

شہر کے دوسرے کنارے سے آتی ہوئی اس آواز میں میرا پہلا تاثر تو اس پختگی کو دریافت کرنا تھا جو رموزِ شعر میں کرافٹ کی بنیاد ہے مگر یہ بھی ہے کہ گزرے ایام نے ان کی فکری اور جمالیاتی خوب صورتی کو مزید نکھار دیا ہے۔ گزرتی عمر کے ساتھ رایگانی کا وہ احساس جو ہر سچے تخلیق کار کا نصیب ہے، جا بجا نظر آیا، فطرت اور مناظر کے سامنے گنگ ہو جانے کی کیفیت، محبت اور اس کے ترفع کا احساس، حسن اور اس کی گیرائی و گہرائی کا شعور اور سب سے بڑھ کر کائنات کے سامنے اپنے محدود ہونے کا ادراک۔

میں ساری زندگی اگر احمد حسین مجاہد کا صرف ایک ہی شعر سنتا تو بھی مجھے اس زندگی کی رایگانی کا احساس نہ ہوتا؛

یہی کہ چاہا کسی کو اور اس کو پا بھی لیا
لیا ہے کام محبت سے کتنا کم میں نے

توصیف خواجہ

لفظ وخیال کی جاریہ 'کساد بازاری' میں کہ جہاں ہر کس و ناکس شاعر ہونے بلکہ از خود سخن کا سرخیل کہلوانے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے، ایسے نوانجوں کا دم غنیمت ہے جو 'کاٹا اور لے دوڑی' کے آسان راستے کو اختیار کرنے اور شہرت کی تام جھام سے علاقہ رکھنے کے بجائے سخن کی دیوی کو رجھانے لبھانے اور کسی مہربان ساعت کی صبر آزما انتظاری میں نیم شبی کا روغن جلانے کو ترجیح کرتے ہیں اور اسی لائے اپنے نصیب کے گوہر و مرجان سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ گو معدودے چند لیکن انہی درویشوں کے دم سے شاعری کا اعتبار اور بیان و اظہار کا معیار و اعتبار استقرار رہتا ہے۔ احمد حسین مجاہد کا شمار بھی سخن وروں کی اسی قبیل میں کیا جانا چاہیے جن کا زیر نظر اور تازہ مجموعہ 'شعر شہر کے دوسرے کنارے سے' پیش نظر ہے اور جو سطر در سطر، مصرعہ بہ مصرعہ میرے اس قیاس کی بھرپور تائید کرتا ہے کہ لمحہ بہ لمحہ پیچیدہ تر ہوتی زندگی اور اس کے مزعومات کے مقابل ایسی ہی شاعری کا جواز اور ضرورت ہے جو اپنے زمنی اور بشریاتی لوازم سے منسلک ہوتے ہوئے نئے آدمی کی ماجرائیت اور صارفیت وصناعی سے کھنچے سیاسی اور معاشی جبریے کے روبرو، سراسر احساسی اور انسانی بیانیہ مرتب کرنے کی داعی اور اہل ہو۔
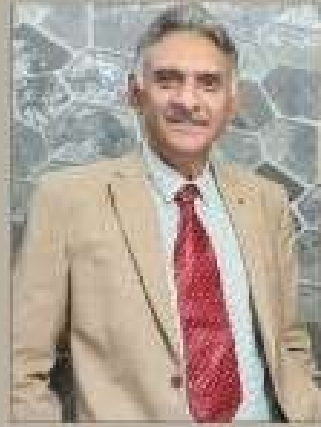
زیر نظر گلدستۂ شعری کی بیشتر شاعری اسی تہذیبی تقاضے سے عہدہ برآ ہونے کی ستارہ شناس ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کے مواد و کشید پر کسی طے شدہ مقصدیت کا شائبہ نہیں ہوتا کہ احمد حسین مجاہد کے شعری سلوک کا اول و آخر، وظیفہ کل شاعری ہی ہے، کسی نوع کی تعلیمیت نہیں۔ وہ ہنر کی فضیلت اور خیال و خواب کے تقدم کی پاس داری کرتے ہوئے یہ وہبی فریضہ انجام دیتے ہیں اور بکمال خوبی و سلیقہ سے۔ ہر چند کہ ان کی شاعری میں روایت کے رچاؤ کا وتیرہ بہت واضح ہے لیکن یہ کسی طور روایتی نہیں بلکہ غیر معمولی طور پر تازہ، رواں اور حیات نو کے تہذیبی و حسی مطالبات کی مظہر ہے۔ اس مجموعۂ شاعری کا 'نمایاں تر' وصف یہ ہے کہ گرچہ اس میں غزل اور نظم دونوں کی موجودی اور نمائندگی کا التزام روا رکھا گیا ہے لیکن یہ احتیاط بہر صورت ملحوظ رکھی ہے کہ ان کی نظم پر غزلیہ آہنگ کے اثرات اور غزل پر موضوعاتی لپک جھپک کی چھاپ دکھائی دے نہ شاعری کی تاثیر ماند پڑے اور اس فصل کی حقیقی تحریک کی جائے تم ہے۔

خوشبو اور حرارت سے معمور اس شعری کارنامے کا دلی خیر مقدم کرنے کے سوا میرے پاس کوئی دوسرا چارہ نہیں۔

حسین مجروح

Rs:900